Fikr-o-Nasar (Islamabad) 13:10 (1976)

تاریخ و فلسفۂ سائنس

حکیم محمد سعید

جارج سارٹن کے قول کے مطابق بنی نوعِ انسان کی صرف دو قسمیں ہیں۔ اول وہ انسان جو کہ مشاہدات اور تجربات کی بنیاد پر قدرت کے اسرار و رموز کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ دوسرے وہ جو کہ ایسا نہیں کرتے۔ لیکن میرے خیال میں یہ تقسیم زیادہ درست نہیں ہے۔ میرے نزدیک بھی انسان کی قسمیں دو ہی ہیں لیکن اس سے قدرے مختلف ہیں۔ اول وہ جو کہ سرسری مشاہدات اور معمولی تجربات کی بنیاد پر قدرت کے اسرار و رموز کو وقتی طور پر سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں، دوسرے وہ جو کہ اپنے عمیق مشاہدات اور وسیع تجربات کی بنیاد پر، زیادہ سے زیادہ وقت صرف کر کے، قدرت کے اسرار و رموز کو سمجھ کر معلومات میں اضافہ کرتے ہیں اور اپنے نتائجِ افکار سے دوسرے بنی نوع انسان کو فائدہ پہنچانے کی پُرخلوص کوشش کرتے ہیں۔ اول الذکر عام لوگ ہیں اور موخر الذکر وہ سائنسدان ہیں جن کی کاوشوں کے نتائج عام لوگوں کے کام آتے ہیں۔

سائنس اور انسانی زندگی میں قریبی تعلق ہے۔ عہدِ عتیق کا انسان سائنس کے اصولوں سے پوری طرح واقف نہیں تھا۔ اپنے ابتدائی عہد میں وہ کسی قاعدے کے مطابق نوامیسِ قدرت سے فیض نہیں پاتا تھا بلکہ وہ چیزیں خود بخود اپنا جلوہ دکھا کر سامنے آتیں اور طریقِ استعمال بتانے کے ساتھ ساتھ دعوتِ فکر و عمل دیتی تھیں۔ وہ اپنی ظاہری آنکھ سے چیزوں کا مشاہدہ کرتا تھا اور سوچتا رہ جاتا تھا:

سبزہ و گل کہاں سے آئے ہیں　　　ابر کیا چیز ہے ہوا کیا ہے

ڈالی سے گرا ہوا سیب انسان نے کھا لیا، لیکن اُسے یہ سوچنا بھی پڑ گیا کہ یہ درخت کیونکر اُگتا ہے اور اگر سورج کی شعاعیں پودے کو پروان چڑھانے میں مدد دیتی ہیں اور پھلوں میں رس

ڈالتی ہیں نوع انسان کے نشوونما کی رفتار تیز کرنے اور لطافت و شیرینی میں اضافہ کرنے کے لئے کیا کچھ کر سکتی ہیں۔ درحقیقت اس انداز میں سوچنا ہی سائنس کی دنیا میں ابتدائی قدم تھا جو کسی قاعدے اور قانون کے بغیر خود بخود اٹھ گیا تھا۔ وہ ایک عام انسان کا سیدھا سادا اندازِ فکر تھا ایک ماہرِ نباتیات نے کچھ عملی سعی و کاوش اور فکرِ بلیغ سے کام لے کر اُن رازہائے سربستہ کو منکشف کیا جو کہ ایک عام انسان کے لئے محض چیستان تھے۔ یہ سائنسدان تھا۔ عمل کی دنیا میں یہ دوسرا قدم تھا۔ پھر گرتے ہوئے سیب کو دیکھ کر کششِ زمین کا نظریہ قائم کرنا اس سمت میں بہت بعد کا تیسرا قدم تھا۔

انسان کی زندگی تو آج سے دس بارہ ہزار سال پہلے بھی بسر ہو جاتی تھی۔ وہ کبھی عہدِ شیر خوارگی میں اور کبھی عمرِ طبعی گزار کر فوت ہوتا تھا، بالکل اُسی طرح جیسے آج کل ظہور میں آتا ہے۔ لیکن اُس وقت اُس کی اور دوسرے حیوانات کی زندگی میں کوئی زیادہ فرق نہیں تھا۔ اشرف المخلوقات کہلانے کا شاید وہ مستحق نہیں سمجھا جا سکتا تھا۔ یہ خطاب تو خالقِ حقیقی نے دیا تھا لیکن ساتھ ہی یہ تاکید بھی کر دی تھی کہ اپنے آپ کو اس لائق بناؤ، سوچ سمجھ سے کام لو۔ انسان اشرف المخلوقات کہلانے کا مستحق اسی وقت قرار پا سکتا ہے جب کہ اس میں ذوقِ جستجو ہو اور علم کی لگن اس کی ضروریاتِ زندگی میں شامل ہو جائے اور اُس کی ہر کاوش ایک فکرِ بلیغ بن کر منزل کو جا لینے کا تہیہ کر لے۔ عقل و فراست سے کام لینا اور عمل کی دنیا میں مضبوط قدم اٹھانا ہی تو سائنس نے سکھایا ہے۔ یہ اصطلاحی اعتبار سے جس لاطینی لفظ سے مشتق ہے، اس کا مفہوم ہی ادراک ہے۔ وہ جاننے، سمجھنے، دانشمند ہونے یا سیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ گویا علم سے شناسائی حاصل کرنا ہر دور کے انسان کا فرض رہا ہے۔ اِسی کی بدولت اس نے اپنی زندگی کو خوشگوار بنایا، نئی دریافتوں سے فیض پایا، عرفانِ الٰہی حاصل کرنے کا طریقہ معلوم کیا اور اس طرح اپنے آپ کو اشرف المخلوقات کہلانے کا مستحق بنا لیا۔

کون نہیں جانتا کہ سائنس کی طاقت اس کے طریقۂ کار میں مضمر ہے۔ اور استقرائی طریقۂ کار وہ ذریعہ ہے جس سے قانونِ الٰہی کے عمل کو سمجھا جا سکتا ہے۔ لیکن یہ راز خود بخود منکشف نہیں ہوتے۔ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالاَرضِ نے رموزِ کائنات کو اس طرح اپنے قبضۂ قدرت میں رکھا ہے کہ

بنی نوعِ انسان پر اُن کا انکشاف ایک دم نہ ہو، بلکہ بتدریج ان کا اکتساب ہو، تاکہ انسان تمام تخلیقات پر فوقیت پانے اور اشرف المخلوقات کہلانے کے لئے عملِ پیہم میں لگا رہے اور کبھی بھی غافل ہو کر ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھا نہ رہے۔ گویا قدرت سائنسدانوں کے ساتھ وہی سلوک کرتی ہے جو ماں باپ اپنے بچوں کے ساتھ کرتے ہیں۔ بچوں کو مٹھائی کی سب ڈلیاں ایک دم نہیں دی جاتیں۔ وہ سب کچھ کھالیں تو بدہضمی ہو جائے اور آئندہ کے لئے کچھ باقی بھی نہ رہے۔ اسی طرح سائنس دانوں کو اگر قدرت کے سارے رموز ایک دم معلوم ہو جاتے تو یہ فیصلہ کرنا مشکل ہوتا کہ کس کو اپنا کر کام میں لایا جائے اور کسے نظر انداز کر دیا جائے۔ دراصل زندگی عملِ پیہم ہی کا نام ہے۔ یہ سلسلہ کبھی ختم نہ ہوگا۔ ہر دور کے سائنسدان نت نئی باتیں معلوم کرتے ہی رہیں گے۔

حقیقت میں سائنس نام ہی ہے اُن حقائق کے مطالعے کا جو پیہم تجربات اور مسلسل آزمائشوں سے بتدریج حاصل ہوتے رہیں، پرانے اور نئے انکشافات کے باہمی ارتباط سے ہر آن نئے انداز میں ان کی شیرازہ بندی کی جائے تاکہ ہم اور آنے والے انسان علم و حکمت کے دروازے کھول کر اُن حقیقتوں کا ادراک کر سکیں جو اُن کی تہہ میں پوشیدہ ہوں۔ یہ سلسلہ جاری ہے اور جاری رہے گا۔

اب سے کچھ عرصے پہلے کے عہد کو زمانۂ برق و بخارات کہا جاتا تھا۔ سائنس کی دریافت کردہ اِن طاقتوں نے حرکت کی دنیا میں ایک انقلاب پیدا کر دیا تھا۔ پھر پٹرول کی دریافت نے ایک نیا نظام قائم کیا۔ موٹریں چلنے لگیں۔ ہوائی جہاز اُڑنے لگے۔ موجودہ زمانہ ایٹمی یا جوہری طاقت کا ہے۔ تحقیقات کا دامن ہنوز تنگ نہیں ہوا۔ اس میں نئی وسعتوں کی گنجائش ہے۔ انسان کو متعدد بار محوِ حیرت ہو کر سوچنا پڑے گا کہ زمانہ کیا سے کیا ہو رہا ہے اور کیا سے کیا ہو جائے گا۔ سائنس دانوں کی کاوشیں ایک نیا روپ دھاریں گی۔

یہ ماننا پڑے گا کہ بتدریج انکشافات نے سائنس کی ہر چیز کو فرسودہ ہونے سے محفوظ رکھا ہے۔ کسی نہ کسی صورت میں اُس سرمایۂ تحقیقات سے آج بھی کام لیا جاتا ہے جو ہزاروں سال پہلے انسانی دقوف میں آئی تھیں۔ وہ بجنسہٖ نہ سہی، کسی قدر ترقی یافتہ معیار پر اپنا جلوہ کسی نہ کسی رُوپ

میں دکھاتی ہی رہی ہیں۔ جدید کرشموں کے سامنے پرانے کارنامے ماند نہیں پڑتے اور نہ اُن کو طاقِ نسیان پر رکھا جا سکتا ہے۔ کل کے سائنسی شعبدے آج ایک عظیم قوت اور حقیقت بنے اور آئندہ عظیم تر اور وقیع تر ہو جائیں گے۔

سائنس کی مختلف قسموں کے اعتبار سے جتنے بھی علوم اس وقت رائج ہیں ان میں شاید طبیعیاتی علوم کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ طبیعیاتی علوم کی ابتدا تدریجی اور غیر شعوری مشاہدات کے ذریعے سے ہوئی ہوگی۔ اس صف میں بھی غالباً پہلا درجہ فلکیات کو دیا جا سکتا ہے کیونکہ انسان نے، جب وہ کھلے آسمان کے نیچے رہتا تھا اور سر چھپانے کے لئے درختوں کا سایہ کافی سمجھتا تھا، نورِ آفتاب اور ضیائے قمر کو ستاروں کی چمک دمک اور اُن سب کی حرکت رفتار کو اور ان کے اثرات و نتائج کو کھلی آنکھ سے دیکھا اور ہر کسی نے اپنے اپنے احساس و تاثر کے تحت کوئی رائے قائم کر لی۔ رفتہ رفتہ اُس کے مشاہدات نے اصول و قواعد کی پابندیوں کے ساتھ ایک باقاعدہ علم کی صورت اختیار کر لی۔ ہمیں اس سے بحث نہیں ہے کہ انسان نے اجرامِ فلکی میں سے کس کس کو اپنا دیوتا مانا یا دیوی ہونے کا خطاب دیا کیونکہ اس طرح کے عقائد کو سائنس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

فلکیات کے بعد شاید حیاتیات کو دوسرا درجہ نصیب ہوا ہوگا۔ انسان نے فطری تقاضوں کے تحت اپنی خواہشات کو پورا کیا اور اس طرح اپنی نسل کو بڑھایا۔ عمرِ طبعی کو پہنچ کر یا اُس سے پہلے کسی نامعلوم وجہ کی بنا پر مر گیا۔ اس نے بیمار کو تندرست کرنے یا مرنے والے کو موت کے چنگل سے بچانے کے لئے کچھ طریقے اختیار کئے ہوں گے۔ یہ علاج کے سائنسی پہلو کا ایک بے دلیل شعور تھا لیکن جب کیوں، کیونکر، کس طرح اور کس لئے کا دَور آیا تو وہ قدرت کے مظاہر میں شامل ہو کر افزائش و نشوونما اور صحت و تندرستی کے معاملے میں ایک دوسرے کا شریک رہنے لگا۔ اس کے لئے کچھ اصول مرتب کئے، کچھ طریقے معلوم کئے۔ اور یہ سب کچھ عمیق غور و فکر کے بعد ممکن ہوا ہوگا۔ اس میں شک نہیں کہ عہدِ قدیم کے لوگ اور بعض غیر ترقی یافتہ ملکوں میں اب بھی بہت سے لوگ بیماریوں کو ارضی و سماوی آفات سے تعبیر کرتے ہیں لیکن کسی عہد میں بھی کسی شخص نے جان بوجھ کر یا انجان بن کر ایسے افعال کا ارتکاب نہیں کیا جن سے بیماریاں لاحق ہوتی ہوں یا موت

واقع ہو سکتی ہو۔ وہ روزِ اوّل سے اُن آفات سے بچنے یا نجات پانے کے کچھ نہ کچھ طریقے معلوم کرتے رہے ہیں۔ یہ درست ہے کہ عہدِ قدیم کے لوگوں کو بعض صورتوں میں بالکل یا کسی حد تک کامیابی نہیں ہوئی تھی۔ لیکن عقیدے کے ساتھ ساتھ انہوں نے اپنے مشاہدے اور تجربے کی بنیاد پر اس کے اسباب و علل معلوم کرنے کے پہلوؤں پر غور کیا اور انہیں اس ضمن میں اس وقت کے شعور کے مطابق کامیابی بھی ہوتی رہی۔ بہت سے اور معاملات میں بھی انہوں نے اصل وجہ معلوم کئے بغیر نتائج کا اندازہ ضرور کر لیا۔ شروع میں پریشانیوں کا سامنا رہا پھر تذبذب کا عالم طاری ہوا۔ سوچ بچار سے کام لیا تو بے یقینی کی کیفیت دُور ہوئی۔ ایمان و آگہی کے دروازے کھلنے لگے۔ بس یہیں سے سائنس کی بنیادی تاریخ شروع ہوئی اور یہی اس کا ابتدائی فلسفہ ہے کہ سمجھ میں نہ آئے تب بھی اُس کی حقیقت کو مان لو۔ گویا حقائق کا شعور سائنس کی تاریخ ہے اور حقائق کی حقیقت کو سمجھنا اس کا فلسفہ ہے۔

اب سوچنا یہ ہے کہ اصطلاحی اعتبار سے فلسفۂ سائنس سے کیا مراد لی جائے؟ اس سوال کا جو بھی جواب ہو، وہ فلسفۂ سائنس کی تاریخی ابتدا پر اثر انداز ہو سکتا ہے۔ یعنی اگر یہ نظریہ مان لیا جائے کہ فلسفۂ سائنس دراصل تجزیاتی یا مظاہراتی طریقے کے کسی مخصوص جزو کا نام ہے تو اس کے تاریخی پہلو کا آغاز اس کے استقرائی یا استخراجی دَور سے پہلے ممکن نہیں ہو سکتا۔ اور اگر فلسفۂ سائنس کی تعریف یہ کی جائے کہ وہ ایک ایسا شعوری اندازِ تفہیم ہے جس کے تحت قدرتی علوم کے اصول و قواعد، طریق کار اور نتائجِ افکار کا فلسفیانہ تصور ممکن ہے تو زنجیر کی کڑیاں انسانی معاشرے کے قدیم ترین دور سے جا ملیں گی اور اس طرح اس کے تاریخی پہلو پر روشنی پڑنے لگے گی۔

اس حقیقت کو مان لینے کے بعد یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ دنیا کی قدیم ترین تہذیبوں کا آغاز دریائے نیل، دجلہ و فرات اور دریائے سندھ کی وادیوں میں ہوا اور یہ ولادتِ مسیحؑ سے بھی پانچ ہزار سال پہلے کی بات ہے۔ مصر، بابل، نینوا، آشوریہ اور سندھ میں آثارِ قدیمہ کی کھدائی کے بعد ماہرینِ آثاریات نے جو کچھ دریافت کیا اور ہمارے سامنے پیش کیا ہے اس سے سائنس کے قدیم ترین عہد کی یاد تازہ ہوتی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ اس وقت کی سائنسی تحقیقات

اِس عہد کے بعض لوگوں کی نگاہ میں زیادہ لائقِ اعتنا نہیں ہوں گی۔کیونکہ زمانہ بہت ترقی کر گیا ہے۔لیکن حقیقتاً علم کے تاریخی مطالعے کے لئے ہر دور کو سامنے رکھنا ضروری ہے۔پھر یہ بھی ملحوظ رکھنا ہوگا کہ کل تک ہمارے آباؤاجداد کے لئے جو باتیں حیرت انگیز تھیں، آج وہ ہماری روزمرہ کی معلومات میں شامل ہیں اور ہم ان کے بارے میں ذرا بھی اظہارِ تعجب نہیں کرتے۔آج جو باتیں ہمارے لئے حیران کن ہیں، کل منزلِ استعجاب سے ہٹ کر ہماری اولاد کے لئے عام معلومات کے ذخیرے میں جگہ پالیں گی۔کیونکہ علمی اعتبار سے زمانہ مسلسل ترقی پذیر ہے اور علم کی کوئی انتہا نہیں۔وہ ہمیشہ ہی ترقی پذیر رہے گا۔لیکن پرانی دریافتوں کو یہ کہہ کر کہ وہ فرسودہ ہو گئی ہیں، نظرانداز نہیں کیا جا سکتا کیونکہ موجودہ ترقیوں کی عمارت انہی بنیادوں پر کھڑی کی گئی ہے جو ہزاروں سال پہلے رکھی گئی تھیں۔مثال کے طور پر پہیے کی ایجاد کا سہرا عہدِ فراعنہ کے مصریوں کے سر ہے۔آج کسی بھی سائنسی دریافت کا جائزہ لیا جائے تو اس کی ہر منزل میں پہیے کا وجود کسی نہ کسی صورت میں کارفرما نظر آئے گا۔حمورابی کا زمانہ بابل کی تہذیب کا زریں عہد تھا۔اس کا نافذ کیا ہوا قانون اس وقت کی بہت سی سائنسی ترقیوں پر روشنی ڈالتا ہے۔ دریائے سندھ کے کنارے ٹیکسلا، موہنجوداڑو اور ہڑپا کے مقام پر کئی تہذیبیں پروان چڑھیں اور اپنے نقوش چھوڑ گئیں۔ان میں سائنسی دریافتوں کی جھلک نمایاں طور پر نظر آتی ہے۔

اب کئی صدیاں گزار کر ذرا مغرب کی طرف آیئے۔اہلِ علم صاف لفظوں میں تسلیم کر چکے ہیں کہ یونان اور روما کے سوا باقی تمام یورپ میں دسویں صدی عیسوی تک تاریکی کے بادل چھائے رہے۔خصوصاً سلطنتِ روما کی تقسیم نے بے چینی اور بے اطمینانی کی فضا طاری کر دی تھی، جس میں کسی سائنس کی ترقی کے لئے حالات زیادہ سازگار نہیں ہو سکتے تھے۔وہ اس دوڑ میں بالکل پیچھے تو نہیں رہے لیکن وہ تیز رفتاری نہیں دکھائی جو کہ فلسفہ و حکمت کی دنیا میں ممکن ہوئی۔خود مغرب کے اربابِ نظر بھی اس حقیقت کا اعتراف کر چکے ہیں کہ اہلِ یونان نے نظریے اور تصورات تو قائم کئے لیکن اس راہ پر عملی قدم زیادہ استواری کے ساتھ نہیں اٹھایا۔وہ اہلِ ہنود کی طرح دیوتاؤں اور دیویوں کی باہمی چشمک یا عشوہ طرازیوں میں الجھے رہے۔اس کی وجہ وہی تھی جو بیان کی گئی ہے کہ ان کی افتادِ طبع عملی سے زیادہ فلسفیانہ تھی۔انہیں دلچسپی تھی تو ظن و قیاس سے اور استدلال

واستخراج سے۔ وہ ماورا کی باتیں زیادہ کرتے، عملی دنیا میں قدم کم رکھتے تھے۔ اہلِ مغرب تو نویں تا ہویں صدی عیسوی کو مسلمانوں کے اعتبار سے تاریک دور کہنے میں پیش پیش ہیں حالاں کہ اسی دور میں مسلمانوں نے وہ کارنامے انجام دیئے ہیں کہ آج کے دور میں ہم ان کو محیّرالعقول قرار دینے پر مجبور ہیں۔ کیونکہ ہماری آج کی بیشتر تعداد سائنسی حقیقتوں کی بنیاد اسی دور میں ملتی ہے۔

ایسی صورت میں عرب کے مسلمان اگر قدم بڑھا کر صحیح سعی و کاوش سے کام نہ لیتے تو عہدِ عتیق کا سرمایۂ معلومات قطعی طور پر ہمیشہ کے لئے تباہ ہو جاتا۔ یہ بیان بھی متعصّب مورخین کی غلط بیانی کا کرشمہ ہے کہ مسلمانوں نے ۶۴۰ء میں اسکندریہ فتح کرنے کے بعد وہاں کا عظیم کتب خانہ جلا کر خاک کر دیا۔ اگر ایسا ہوتا تو آج ان قدیم علوم کے ساتھ، جو وہاں محفوظ تھے، اس وقت سے پہلے کے عالموں کے نام تک صفحۂ ہستی سے مٹ جاتے کیونکہ اس کے سوا کوئی اور ذریعۂ معلومات موجود نہیں تھا۔ پھر یہ کہنا بھی غلط ہے کہ عرب سائنس دانوں نے تمام علوم کے نظریات اہلِ یونان سے سیکھے اور خود کوئی انکشاف نہیں کیا۔ اس کے برعکس یہ کہا جا سکتا ہے کہ انہوں نے یونانیوں کے بعض غلط نظریات کی تصحیح کی۔ ارسطو نے جو کہ طبیعیات، حیوانیات اور نباتیات کا ماہر تھا، یہ دعویٰ کیا کہ مردوں کے دانتوں کی تعداد عورتوں کے دانتوں کی تعداد سے زیادہ ہوتی ہے۔ جالینوس نے کہا کہ انسان کے نچلے جبڑے میں دو ہڈیاں ہوتی ہیں۔ دونوں باتیں غلط تھیں۔ رازی نے صحیح رائے پیش کی۔ ارسطارکس کا یہ کہنا تو صحیح تھا کہ زمین سورج کے گرد گھومتی ہے لیکن زمین سے سورج تک کا فاصلہ جو اس نے محسوب کیا وہ اتنا کم تھا کہ اتنا فاصلہ ہونے پر کرۂ ارض تمازتِ آفتاب سے جل بھن کر کبھی کا ختم ہو چکا ہوتا۔ ابن الہیثم نے جو فاصلہ معیّن کیا وہ حقیقت سے بالکل قریب تھا۔ جالینوس کے نظریۂ دورانِ خون کی تصحیح ابن النفیس نے کی۔ ایسی صدہا مثالیں دی جا سکتی ہیں۔ خود اہلِ یورپ کی بھی یہ رائے ہے کہ اگر عرب کے مسلمان سائنس کو ترقی دینے میں نئے انکشافات نہ کرتے تو بہت سی معلومات اب بھی پردۂ راز میں رہتیں۔

مسلمانوں کے لئے فرمانِ رسولؐ ہر حال میں مشعلِ راہ ہے۔ رسولِ مقبول صلعم کی یہ ہدایت کہ "تم علم حاصل کرو" مسلمانوں کو حصولِ علم کی راہ پر لگا گئی، اس شد و مد کے ساتھ کہ راہ میں کتنی ہی دشواریاں کیوں نہ حائل ہوں، ان پر قابو پانا اور ترقی کے راستے پر گامزن رہنا انسان کا فرض

ہے۔ یہ بھی ارشاد ہوا کہ ہر نماز کے بعد دعا مانگو تو اللہ سے التجا کرو کہ "اے اللہ ہمارے علم میں اضافہ کر" کیونکہ علم میں اضافہ ہی ترقی کی منزلیں طے کراتا ہے۔

عرب کے مسلمان سائنس دانوں کے دوش بدوش چند یہودیوں اور نصرانیوں نے بھی ترقئ علم کی منزل میں نیک کام کئے، اور یہ بھی ثبوت ہے اس حقیقت کا، کہ مسلمانوں نے علم کے معاملے میں ذرا بھی تعصب کا اظہار نہیں کیا کیونکہ علم کی منزلیں ہر قسم کے فرق و امتیاز کی حد بندیوں سے آزاد ہوتی ہیں۔ سب سے پہلے ان یونانی اور ہندی مسودات کا، جو فلکیات، طبیعیات، کیمیا اور ادویہ سے تعلق رکھتے تھے، عربی زبان میں ترجمہ کیا گیا، کیونکہ زنجیرِ علم کی پہلی کڑی اسی طرح قبضے میں آتی ہے علم ہندسہ میں رومی طرز کے اعداد بڑی دشواریاں پیدا کرتے ہیں۔ عربوں نے ہندسوں کا نیا نظام قائم کیا اور دنیا کو پہلی بار صفر کا تصور بھی دیا۔ آٹھویں صدی میں خلیفہ ہارون الرشید اور ان کے بیٹے مامون رشید نے جو علمی خدمات انجام دیں، انہیں کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا دارالترجمہ اور بیت الحکمت نے جو کارہائے نمایاں انجام دیئے وہ یورپ کی نشاۃ ثانیہ میں بطور خاص مفید ثابت ہوئے۔ اسی عہد کا حکیم جابر ابن حیان دنیا کا سب سے پہلا عرب نژاد کیمیادان ہے جس کی تحقیقی کاوشیں آج تک قابلِ قدر سمجھی جاتی ہیں۔ سائنسی علوم کے مشہورِ آفاق اور عظیم ترین مورخ جارج سارٹن نے عرب کے مسلمان علما کو جن الفاظ میں خراجِ تحسین پیش کیا وہ قابلِ قدر ہیں۔ اس نے اپنی ضخیم کتاب "تاریخِ سائنس" میں یہ التزام رکھا کہ ہر صدی کے دو حصے کئے اور ہر حصے کو اس عہد کے کسی سب سے بڑے عالم سے منسوب کیا۔ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ ساتویں صدی سے گیارہویں صدی تک ہر حصے کا انتساب کسی نہ کسی مسلمان عالم کے نام سے کیا گیا ہے۔ دنیا کے کسی ملک یا قوم کو یہ فخر نصیب نہ ہو سکا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ عہدِ متوسط کی ساری ترقیاں اسلام یا بالفاظ دیگر عرب کے مسلمانوں کی فراست و دانش سے تعلق رکھتی ہیں۔ اس دور کے تمام عالموں کی کاوشوں کا احاطہ ایک مقالے میں ممکن نہیں ہو سکتا حتیٰ کہ ان کے نام تک بھی نہیں گنوائے جا سکتے ان میں سے چند نام یہ ہیں۔ جابر ابن حیان۔ الکندی۔ الخوارزمی۔ الفارابی۔ الرازی۔ الفرغانی۔ ثابت ابن قرہ۔ البتانی۔ حنین ابن اسحاق۔ ابراہیم

ابن سنان۔ المسعودی۔ السفیری۔ ابوالوفا۔ علی بن عباس۔ ابوالقاسم زہراوی۔ ابن الجزار۔ البیرونی۔ ابن سینا۔ ابن یونس۔ ابن الہیثم۔ ابن النفیس۔ علی ابن عیسیٰ۔ الغزالی اور عمر خیام وغیرہ

ان حقائق کے پیش نظر جب ہم موجودہ تہذیب و تمدن کی اعلیٰ قدروں کا تصور کرتے ہیں تو ان عرب سائنس دانوں کی عمیق کاوشوں کو سراہنا پڑتا ہے جن کے کمالات کی بدولت ساری دنیا، خصوصاً اہل یورپ، موجودہ منزل تک پہنچے ہیں۔ اگر ان تمام ایجادوں کو الگ رکھ دیا جائے تو نتیجتہً ہم سب اس دور میں پہنچ جائیں گے، جہاں ہمارے اجداد دس بارہ ہزار سال پہلے سیدھی سادی زندگی بسر کرتے تھے۔ لہٰذا جب سائنسی ترقیوں کی اس درجہ اہمیت ہو تو ہمیں ان کی قدر کرنی چاہیئے اور حسب ضرورت ان کے فروغ اور مزید انکشافات کی کوشش کرنی چاہیئے تاکہ ہم قدر شناسی کا عملی ثبوت دے سکیں۔ اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ ہم میں سے ہر شخص ایک اعلیٰ سائنسدان بن جائے کیونکہ یہ مرتبہ اگر ناممکن نہیں تو سہل الحصول تو قطعی نہیں ہے۔ اس لئے ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم کم سے کم سائنس کی بنیادی باتوں کو سمجھیں، تاریخ کی روشنی میں اس کی تدریجی ترقیوں کا جائزہ لیں، فلسفہ سائنس کی اصلیت کا ادراک پیدا کریں اور سائنس کے کسی بھی بظاہر عجوبے کو سربستہ راز سے تعبیر نہ کریں۔ علمی اعتبار سے یہ عقیدہ راسخ کر لینا چاہیے کہ قوانینِ فطرت اور نوامیسِ قدرت کی شناسا قومیں ہی ترقی کی راہ پر گامزن رہ کر بامِ عروج تک پہنچتی ہیں۔ ہمیں یہ ضرور سمجھ لینا چاہیئے کہ اصل حقیقت تو صرف خالقِ حقیقی کی ذات میں پنہاں ہے جس کی تفہیم کلّی طور پر جلد ممکن نہیں اور نہ یک وقت اس کا انکشاف ہم پر ہو سکتا ہے۔ بلکہ اسرار و رموز کی جھلکیاں بتدریج ہمیں جلوہ دکھاتی رہیں گی۔

شاعر مشرق نے کہا تھا:۔

کھول آنکھ، زمیں دیکھ، فلک دیکھ، فضا دیکھ
مشرق سے ابھرتے ہوئے سورج کو ذرا دیکھ !

یہاں مشرق سے کسی سمت کا تعین مقصود نہیں بلکہ مراد اس خطۂ ارض سے ہے جو مسلمانوں کا ملجا و ماویٰ ہے۔ ایک زمانہ تھا کہ قدرت کے اسرار و رموز اور قواعد و قوانین کو سمجھنے منکشف

کرتے ادران سے فائدہ اٹھانے میں ہم اہلِ مشرق صفِ اول میں نظر آتے تھے۔ لیکن آج سورج سے اکتسابِ نور کرنے والے چاند کی طرح مغرب کے موجودہ نامور لوگ مستشرقین ہونے کا لبادہ اوڑھ کر شاگرد سے استادانِ فن بن گئے ہیں اور ہم اپنے جادۂ عمل سے ہٹ کر ان کے دستِ نگر نظر آتے ہیں۔ یہ تبدیلی افسوس ناک ہے۔ ناکامی کا ایک سبب غفلت اور بے اعتنائی کی وہ روش ہے جو خود مسلمانوں نے اپنے علوم سے برتی ہے۔ لیکن اب بھی ازالہ ممکن ہے۔ اگر ہم سعئ و عمل کے چراغ لے کر آگے بڑھیں تو اپنی کھوئی ہوئی منزل دوبارہ حاصل کر لیں گے۔ اور کوئی بھی ہماری تہی دامنی یا دریوزہ گری پر طنز و طعن نہیں کر سکے گا۔

حبیب بلیک کی
۴ نئی اور بے مثال بچت کی اسکیمیں

ڈیپازٹ گروتھ سرٹیفکیٹ

ڈپازٹ گروتھ انشورنس سرٹیفکیٹ

۵ سالہ خصوصی فکسڈ ڈپازٹ اکاؤنٹ

انعامی سیونگز اکاؤنٹ